عہدِ نبوّت کے فقہی اصُول

(ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی پروفیسر قانون اسلامی لاکالج شام)

(۳)

آغازِ بحث میں ہم نے اصول فقہ کو دو بڑے ادوار میں تقسیم کیا تھا:

- اصول فقہ عہد صحابہ میں
- اصول فقہ عہد صحابہ کے بعد

اس وقت ہماری گفتگو کا محور اصولِ فقہ کا دورِ اوّل ہے۔ لیکن یہ دورِ اوّل بھی ــــ یعنی اصولِ فقہ بعہدِ صحابہ ــــ دو زمانوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ زمانہ جس میں صحابہ کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تشریف فرما تھی اور دوسرا وہ زمانہ جو آپ کی رحلت کے بعد صحابہ نے گذارا ہے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عینِ حیات تشریع کے جو اصول متداول تھے وہ اُس عہد کے اصول سے (بعض پہلوؤں سے) ممیز ہیں جو آپ کی وفات کے بعد عہدِ صحابہ میں اختیار کیے گئے ہیں اس لیے ہم دورِ اوّل کے فقہی اصول کا مطالعہ اس کے مذکورۂ ذیل دو ضمنی زمانوں کے تحت کریں گے:

- اصولِ فقہ بعہد النبیؐ (اس حصہ پر ہم زیر بحث باب میں گفتگو کر رہے ہیں)
- اصولِ فقہ بعد وفات النبیؐ (اس موضوع پر ہم آئندہ باب میں انشاءاللہ روشنی ڈالیں گے)

عہدِ نبوی کے تشریعی مآخذ | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک تک فقہی و تشریعی نظام کے صرف دو سرچشمے تھے: کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ۔ رہا اجتہاد، تو اس کی جانب بہت نادر حالات میں رجوع کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اجماع کے لیے بھی اس وقت کوئی داعیہ موجود نہ تھا (کیونکہ شارع علیہ السلام خود تعلیم و تفہیم کے لیے موجود تھے)۔

عہدِ نبوت میں قانون کی اصل بنیاد قرآن تھا اور سنّت قرآن کی تشریح و توضیح کرتی تھی۔ اس لیے

وہ قانون کا دوسرا ماخذ تھی) - آیاتِ قرآنی کی تنزیل یا تو ایسے واقعات کے تحت ہوتی تھی جو ہدایتِ الٰہی کے متقاضی ہوتے تھے یا ایسے (تمدنی و اقتصادی) مسائل و قضایا کی مناسبت سے ہوتی تھی (جو وقتاً فوقتاً اسلامی معاشرے میں رونما ہوتے رہتے تھے اور) جن کے بارے میں حکم شریعت دریافت کرنے کے لیے لوگوں کے اندر سوالات پیدا ہوتے تھے۔

کیسی بصیرتِ قانون درکار ہے؟ چونکہ احکامِ قرآنی کی تنزیل جن واقعات یا مسائل کے تحت ہوتی تھی ان کی پوری روداد لوگوں کے علم میں ہوتی تھی اور ان کے اسباب و داعیات سے اور ان کے جملہ پہلوؤں سے وہ علیٰ وجہ البصیرت باخبر ہوتے تھے اس لیے ان واقعات و قضایا کے متعلق نازل ہونے والے احکام ــــ خواہ وہ متعین فرمان کی شکل میں ہوتے یا عمومی کلیات کے لباس یا کسی شرعی اصل کی صورت میں ہوتے تھے ــــ اپنی اصل حقیقت اور ماہیت کے ساتھ ہر سامع کے دل پر اور ہر سائل کے ذہن کی گہرائیوں تک اتر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی بھی ایسے شخص کے لیے جس نے رسول کی صحبت پائی ہوتی تھی اور تنزیلِ قرآن کا زمانہ دیکھا ہوتا تھا احکامِ الٰہی کی "اسپرٹ" اور "منشا" کے فہم میں کسی نوع کے ابہام یا اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نوعیت کا فہم و ادراک اور اسی طرز کی بصیرت و نگاہ ہی قانون شناسی کی وہ اصل سند اور معیار ہے جس کا بہم پہنچانا ہر اُس قانون دان کے لیے ناگزیر ہوتا ہے جو کسی بھی قانون میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ بلکہ یہی وہ وصف ہے جو انسانی ذہن و فکر کو قانون کے ظاہری الفاظ کی پرستش سے نجات دلاتا ہے۔ اور خود اجتہاد و استنباط کے لیے بھی عقلِ صحیح اور ذوقِ سلیم کے علاوہ یہ بنیادی کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد بھی صحابہ کے اندر اگر کسی حکمِ الٰہی کے متعلق مزید ہدایت کی طلب ہوتی تھی تو وہ اس حکم کی "اسپرٹ" اور "منشا" کی تشخیص کے لیے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ صرف اس حکم کی توضیح و تفصیل سے آگاہ ہونے کی خاطر ہوتی تھی۔ اور یہی وہ فرض تھا جو سنت سرانجام دیتی تھی۔

قرآن اور سنت کا باہمی تعلق چنانچہ جب کبھی معاشرے میں نیا مسئلہ یا قضیہ رونما ہوتا ایک نیا

حکمِ الٰہی نازل ہو جاتا اور مجموعۂ قرآن میں ایک نئی آیت کا اضافہ ہو جاتا یا قرآن کے شارح اور مبیّن ہونے کی حیثیت سے ایک نیا ارشادِ رسول ــ سنّت ــ معرضِ ورود میں آ جاتا (اور مجموعۂ قرآن کے ساتھ مجموعۂ سنّت میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا) ۔ چونکہ اس عہد میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی مسلمانوں کے لیے واحد مرجع و ماویٰ تھی ، اس لیے آپ کے حینِ حیات ہی آپ کی سنّت تشریعی نظام کا ماخذ ثانی بلکہ قریب قریب آخری (LAST) قرار پا گئی ۔

جیسا کہ "سنت" کے باب میں گزر چکا ہے سنت فی الجملہ قرآن ہی کے بیان کا نام ہے ۔ اور جس طرح قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حالات و واقعات کے مطابق نازل ہوتا رہا ہے اسی طرح سنّت بھی آپ ہی کی زبانِ مبارک سے حالات و ضروریات کے تحت وارد ہوتی رہی ہے ۔ سنّت اپنی اس حیثیت و منزلت کے ساتھ ۲۲ سال سے زائد عرصہ تک قرآن کے تابع رہی ہے اور قرآن کے تمام مقاصد و اہداف میں بالخصوص احکام و حقوق سے متعلق گوشوں میں شرح و بیان کا فرض بجا لاتی رہی ہے ۔

سنّت کی تین قسمیں | اس شرح و بیان کے اعتبار سے سنّت کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں :

- ــ یا تو وہ کسی جزئی حکم کو کسی اصلِ قرآنی پر منطبق کرتی ہے
- ــ یا قرآن کے کسی مُجمل اور کلّی حکم کی توضیح کرتی ہے
- ــ یا وہ قرآن میں وارد شدہ جزئی وقائع اور قواعدِ کلیہ کی روشنی میں کسی نئے قاعدے کی وضع کرتی ہے ۔

اب ہم آپ کے سامنے سنّت کی ان تینوں قسمیں تفصیل کے ساتھ امثال و شواہد کی روشنی میں واضح کرتے ہیں :

پہلی قسم کی مثالیں | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

ــ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (تم آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ)

ـــــــ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ (مگر یہ کہ لین دین ہو، آپس کی رضامندی سے)

اس نصِ قرآنی میں اللہ تعالیٰ نے دو قانونی اصلوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ہر اصل دوسری اصل کا تتمہ ہے۔ ایک اصل سلبی انداز میں ہے اور دوسری ایجابی صورت میں۔ اوّل الذکر ـــ جو سلبی انداز میں ہے ـــ لوگوں کے لیے باطل اور خلافِ حق طریقوں سے ایک دوسرے کا مال کھانا حرام ٹھہراتی ہے۔ موخر الذکر ـــ جو ایجابی صورت میں ہے ـــ "رضامندانہ معاہدہ" کی شرط لگا کر باہمی لین دین کی اجازت دیتی ہے۔

چنانچہ سنت نے جب دونوں اصلوں سے تعلق رکھنے والے حالات کا جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ لوگ بعض ایسے عرفی اور رواجی طریقوں کے مطابق لین دین کرتے ہیں جو ان کے اندر ایک مستقل نزاع کا منبع بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ لین دین کے یہ طریقے اپنی ظاہری شکل وصورت کی رُو سے قرآن کی قائم کردہ شرعی اصل کے مطابق ہیں یعنی ان میں "رضامندانہ معاہدہ" کا عنصر موجود ہے۔

مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے باغات کے مالکوں کو ایک عرفی شکلِ معاملہ پر کاربند پایا اور وہ یہ تھی کہ باغ کے مالک اپنے پھلوں کو ان کی صلاحیت اُجاگر ہونے سے قبل درختوں پر ہی ان کی بیع کر دیتے تھے یعنی مالک خریدار کو درختوں کے اوپر ہی پھل کو اس حال میں دکھا دیتا تھا کہ ابھی وہ خام حالت میں ہوتے تھے۔ اور اسی حالت میں خرید وفروخت ہو جاتی۔ حالانکہ خریدار کے لیے پھل کے اس مرحلے میں یہ معلوم کرنا محال ہوتا تھا کہ اس کی مقدار کتنی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہو گی؟ چنانچہ بسا اوقات ناگہانی آفات پھلوں کو نقصان پہنچا دیتیں۔ مثلاً سخت جاڑے کا حملہ ہو جاتا یا کوئی ایسی شجری بیماری لاحق ہو جاتی جو شگوفوں کو ہی چٹ کر جاتی اور خریدار کی نگاہ میں پھل کی متوقع مقدار تمام تر یا اس کا کچھ حصہ ضائع ہو جاتا۔ چنانچہ جب پھل توڑنے کا موسم آتا تو یہ ناگہانی حادثے اکثر وبیشتر مشتری اور بائع کے مابین نزاع برپا کر دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ غیر مناسب صورتِ حال دیکھی تو آپ نے اس نوعیت کی بیع کو حرام قرار دیا، اور اس وقت تک درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی خرید وفروخت ممنوع کر دی جب تک پھلوں کی صلاحیت پوری

طرح واضح نہ ہو جائے اور گاہک کو ان کے بخیر و سلامت پختگی تک پہنچ جانے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قابلِ غور ہے: ارایت اذا منع اللہ الثمرۃ، بم یاخذ احدکم مال اخیہ؟ (تمہارا کیا خیال ہے، اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک لے تو پھر تم لوگ کس حق کی بنا پر اپنے بھائی کا مال — پھل کی قیمت — وصول کرو گے؟)

اس صورتِ معاملہ میں اگرچہ "رضامندانہ معاہدہ" کا عنصر موجود ہے، مگر اس کے باوجود سنت نے اس طریقۂ بیع کو حرام کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ معاملہ کی یہ شکل بھی مسلمان بھائی کے مال پر بلا استحقاق دست درازی شمار ہوگی۔ سنت کا یہ بیان تفریعی نوعیت کا ہے یعنی اس میں سنت نے قرآن کی ایک نص پر ایک نئے حکم کی تفریع کی ہے اور اس تفریع یا انطباق کا مدار وہ علتِ تحریم — مال حاصل کرنے کا طریقۂ باطل — ہے جو اصل اور فرع دونوں میں موجود ہے۔

اس قسم کی دوسری مثال بیعِ ملامسہ کی حرمت ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عربوں میں کپڑا فروخت کرنے کا ایک یہ دستور چلا آرہا تھا کہ کپڑا تھان کی شکل میں لپٹا ہوتا تھا اور خریدار کے لیے صرف کپڑے کو ہاتھ سے چھو لینا (لمس) کافی سمجھا جاتا تھا۔ یہ لمس خواہ اندھیرے میں ہوتا اور خواہ خریدار کپڑے کی خوبی و ناخوبی کا کچھ اندازہ نہ کر سکا ہوتا، مگر اس کے باوجود معاہدہ بیع ہو جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورتِ بیع کو بھی (اس کی متعدد قباحتوں کے مدِنظر) مذکورہ نص قرآنی پر تفریع کرتے ہوئے حرام بیوع کی فہرست میں شامل کر دیا۔

تیسری مثال بیع الحبل کی ہے یعنی جانور کے پیٹ ہی میں اس کے بچے کا سودا چکا لینا۔ سنت نے اس بیع کو بھی باطل ٹھہرا دیا۔

دوسری قسم کی مثال بیانِ سنت کی دوسری قسم کی مثال یعنی جب سنت قرآن کے کسی مجمل اور کلی حکم کی تشریح کرتی ہے، فریضۂ زکوٰۃ کی تفصیلات ہیں۔ فریضۂ زکوٰۃ کے ضمن میں سنت نے ابتداً ان تمام اموال کی قسمیں بیان کی ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے۔ پھر زکوٰۃ کا نصاب اور زکوٰۃ کی شرح بیان کی ہے۔ قرآن نے تو صرف یہ کلی حکم بیان کیا ہے کہ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ

تُزَکِّیْھِمْ" اس سے آگے قرآن نے یہ ذکر نہیں کیا کہ مال کی وہ کون کونسی قسمیں ہیں جن پر یہ حکم نافذ ہوتا ہے؟ کیا اس حکم میں ہر طرح کا مال از قسم سامانِ تجارت، زرعی پیداوار، اراضی، پارچات اور اثاث البیت وغیرہ شامل ہے یا بعض قسمیں مستثنیٰ ہیں؟ اسی طرح قرآن نے وجوبِ زکوٰۃ کا نصاب بھی واضح نہیں کیا اور اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مقدار پر زکوٰۃ لاگو ہو جائے گی یا کوئی خاص مقدار مقرر ہے جس سے کم پر زکوٰۃ کا قانون نافذ نہیں ہوگا؟ علیٰ ہذا القیاس قرآن زکوٰۃ کی شرح کے بارے میں بھی خاموش ہے ـــــ لیکن سنت قرآن کے اس مجمل حکم کی پوری تشریح کر دیتی ہے اور مذکورہ بالا امور سے متعلق تمام ضروری تفصیلات فراہم کر دیتی ہے۔ یہ تفصیلات درحقیقت قرآن کے بیان کردہ قاعدۂ کلیہ کے لیے توضیحی بیانات کا درجہ رکھتی ہیں۔

تیسری قسم کی دو مثالیں بیانِ سنت کی تیسری قسم ـــــ یعنی جب سنت قرآن کے اصول عامہ اور احکام جزئیہ کی روشنی میں کسی نئے اصول کو قائم کرتی ہے ـــــ کی پہلی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک ہے کہ: لاضرر و لاضرار فی الاسلام (اسلام میں خود نقصان اٹھانا یا دوسرے کو نقصان پہنچانا درست نہیں ہے)۔ ضرر برداری اور ضرر رسانی کی ممانعت کا مضمون قرآن میں جابجا بیان کیا گیا ہے۔ کہیں یہ مضمون جزوی احکام و حوادث میں مذکور ہے اور کہیں کلی اور عمومی قاعدوں کے تحت ادا کیا گیا ہے۔ جزوی احکام میں سے ذیل کی دو مثالیں اسی مضمون پر مشتمل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں کے بارے میں جن کو طلاقِ رجعی مل چکی ہو اور وہ اپنی عدت کے ایام مکمل کرنے والی ہوں، ارشاد فرمایا:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ	اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے، تو یا تو بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔

یعنی جب ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے دی ہو اور اس کی عدت پوری ہونے والی ہو تو اس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: یا خوشدلی سے اور حسنِ سلوک کی نیت سے رجوع کرلے اور یا

بھلائی کے ساتھ اُسے رخصت کر دے۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ تیسری صورت اختیار کرنے کے بارے میں اس آیت کے ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا	اور تم عورتوں کو ضرر رسانی کی خاطر نہ روکے رکھو کہ یہ
لِتَعْتَدُوا	زیادتی ہوگی۔

یعنی اگر رجوع کر لینے سے مقصد محض یہ ہو کہ عورت کو ستایا اور دق کیا جائے اور اسے نقصان پہنچایا جائے تو یہ ممنوع ہے۔

۲۔ مطلقہ عورت کے لیے ایامِ عدت کے دوران سکنیٰ (رہائش) مہیا کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَأَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ	جہاں تم خود رہتے ہو ان (طلاق شدہ عورتوں) کو
مِنْ وُجْدِكُمْ	بھی اپنے مقدور کے موافق ٹھکانہ دو۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ	اور ان کو تنگ کرنے کی خاطر انہیں ضرر نہ پہنچاؤ۔

یعنی رہائش کے معاملے میں تم مطلقہ عورتوں کو اس نیت سے دق نہ کرو کہ وہ تنگ آکر نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔

ان دو مثالوں کے علاوہ بے شمار ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں جزوی احکام کے ضمن میں ضرر اور ضرار کے مضمون کو ادا کیا گیا ہے اور پھر اس سے منع کیا گیا ہے۔

قواعدِ کلیہ کے ضمن میں اس مضمون کی مثالیں بھی متعدد ملتی ہیں۔ مثلاً وہ تمام آیات اسی مفہوم پر مشتمل ہیں جن میں انسانوں کے جان و مال اور عزت و ناموس پر تعدی کرنے کی نہی کی گئی ہے۔ اور جن میں ظلم و جور اور غصب و جارحیت اور اسی قبیل کے ایسے افعال و اقدامات سے روکا گیا ہے جو ضرر اور ضرار کی تعریف میں آتے ہیں۔ شریعت میں اس مفہوم کے قواعد عمومی انداز میں بکثرت بیان کیے گئے ہیں۔

سنّت نے اس مفہوم کو، جو کتاب اللہ میں جابجا کہیں جزوی احکام کے تحت اور کہیں کلی ارشادات کے بطن میں بکھرا ہوا تھا، اخذ کیا اور اس کی مزید تشریح و توضیح کرتے ہوئے اُسے ایک قاعدہ عامّہ کی شکل میں مرتب کر دیا اور وہ قاعدہ عامّہ یہ ہے: لا ضرر و لا ضرار فی الاسلام

اجتہاد کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عین حیات ہی قرآن کے بعد اپنی سنت کو فقہ و تشریع کی اصلِ دوم کا درجہ دے دیا تھا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی قرآن کے بعد سنت کی اہمیت و منزلت اس عظمت کے ساتھ راسخ ہو گئی تھی کہ ان کے نزدیک اجتہاد کی بہت کم گنجائش باقی رہ گئی تھی۔ اس بارے میں ان کا مدارِ عمل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ — پس اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔

لیکن یہ ۲۲ سالہ دور جو سنت نے قرآن کی تشریح و تبیین کی خدمت انجام دینے میں گزارا۔ اس پورے دور میں سنّت نے حالات و ضروریات کے مطابق اپنے احکام اور تصریحات کو پیش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا اُس کی نوعیت ایک مدرسۂ تربیت (TRAINING INSTITUTE) کی تھی۔ اس مدرسۂ تربیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب شریعت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تاکہ آپؐ کے مشن کو آپ کی معیت میں بھی اور آپ کے بعد بھی بوجہ کامل پورا کریں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ آپؐ گاہے بگاہے پیش آمدہ مقدمات کا فیصلہ صحابہ میں سے کسی ایک کے ذمے لگا دیتے تھے۔ بلکہ اپنے سامنے یہ کام صحابہ سے لیتے رہتے تھے۔ اسی طرح آپ جزیرۂ عرب کے اطراف و دیار میں لوگوں کو قضاء اور فصلِ خصومات کی ذمہ داریاں دے کر بھیجتے رہتے تھے۔ آپ نے اسی طریق کار نے اجتہاد ــــ جسے آپ نے قانون سازی کا ماخذِ ثالث قرار دیا تھا ــــ کی طرح ڈال دی۔ چنانچہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو قاضیٔ یمن بنا کر بھیجا تھا تو آپ نے حضرت معاذ کو نصیحت فرمائی تھی کہ مقدمات کے فیصلوں میں پہلے درجہ پر قرآن اور دوسرے درجہ پر سنّت کو اختیار کیا جائے اور ان دونوں سے جب کوئی رہنمائی نہ ملے تو اجتہاد اور رائے کو ماخذِ قضا بنا لیا جائے

عہدِ نبوت میں اجتہاد محدود پیمانے پر رہا | لیکن یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو لوگ عدل و قضاء کے منصب پر متعین ہو کر ملک کے اطراف و امصار میں جاتے تھے وہ دربارِ نبوت سے بُعدِ مسافت کے باوجود بہر حال جزیرۂ عرب ہی کی حدود میں رہتے تھے اور جس قسم کا ماحول و مقام جوارِ نبوت میں چھوڑ کر آتے تھے اُسی قسم کے ایک دوسرے ماحول و مقام میں پہنچ جاتے تھے۔ جہاں کے اقتصادی و اجتماعی حالات اُسی نہج کے ہوتے تھے جس نہج کے حالات سے وہ پہلے سے واقف ہوتے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان نئے علاقوں میں بھی انہیں زیادہ تر جس نوعیت کے مسائل حوادث سے سابقہ پڑتا تھا وہ ایسے نرالے نہ تھے جن سے وہ قطعاً غیر مانوس ہوتے تھے یا جن کے بارے میں کتاب و سنت کے احکام و ہدایات کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک ــــ جبکہ ابھی اسلامی حکومت کا دائرہ جزیرۂ عرب تک محدود تھا اور صحابہ کو سرا سر نئے اور اجنبی ماحول سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ فقہ کی اصل ثالث ــ اجتہاد ــ نے نمایاں اور قابلِ ذکر رول ادا نہیں کیا تھا بلکہ اس کا چلن گنے چنے قضایا تک محدود رہا۔

عہدِ نبوت تک اجتہاد کا دائرہ کار | چونکہ عہدِ نبوت میں اجتہاد بذاتِ خود بھی محدود تھا اور اس کا دائرہ کار بھی محدود تھا اس لیے اس عہد میں ایسے مسائل میں اجتہاد برتنے کا نہیں آیا جو انفرادی اور شخصی حقوق کے دائرہ سے نکل کر اجتماعی اور ملکی حقوق میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انفرادی اور شخصی حقوق میں بھی اجتہاد کا استعمال زیادہ تر عقود (معاہدات بیع و شرا اور معاملاتِ نکاح و طلاق وغیرہ) اور التزامات (معاہدات کے شرائط و واجبات وغیرہ) میں جاری رہا ہے۔ اور بہت کم ایسی نوبت آئی ہے کہ عقود و التزامات کے علاوہ بھی دوسرے شخصی مسائل میں اس کی طرف رجوع کیا گیا ہے اس کی صرف ایک مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے میں ملتی ہے۔ جس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کے قاضی تھے تو آپ کی عدالت میں نسب کا ایک قضیہ پیش ہوا جس میں ایک لڑکے کے بارے میں تین آدمیوں میں نزاع برپا تھی اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ لڑکا اس کا ہے لیکن اپنے دعوی پر تینوں میں سے ایک بھی ثبوت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے قرعہ اندازی سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جس شخص کے نام قرعہ نکلا لڑکا اس کے حوالے کر دیا اور باقی دو کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ لڑکے والا ان دونوں میں سے ہر ایک کو ⅓ دیت ادا کرے۔